صبح کی تلاش

مائل خیرآبادی

صبح کی تلاش

''ایک بات پوچھوں کیپٹن؟'' سعدیہ نے مشین گن کا ایمونیشن پٹہ رول کرتے ہوئے کہا۔

''ضرور پوچھو!''

''یونیورسٹی میں تمہارا شمار باتونی لڑکوں میں ہوتا تھا۔'' سعدیہ نے دوسرا پٹہ اٹھاتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''لیکن میں دیکھ رہی ہوں تم بہت بدل گئے ہو، کیا میرا آنا ناگوار گزر رہا ہے؟''

کیپٹن نے نم آلود بھوری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ سعدیہ بھی براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

''پتہ نہیں مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' کیپٹن نے کھوئے سے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''سنو عباس!'' سعدیہ نے کہا۔ ''بیشک میں نے مخلوط تعلیم حاصل کی ہے۔ لیکن تعلیم سے فارغ ہو کر میں صرف ایک بیٹی بن گئی تھی۔ جو رات دن صرف ایک ہی خواب دیکھا کرتی تھی جس کے من میں ایک شخص بس رہا تھا۔ لیکن اچانک دھماکہ ہوا۔ خوب کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے اور میں مجبور ہو گئی کہ اس

خطرے سے نبرد آزما ہو۔ جس نے میرے وطن کو گھیر لیا ہے۔''

''عباس اُٹھ کھڑا ہوا۔'' پھر بھی تمہیں گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں آنا چاہئے تھا۔ سعدیہ! ہمارے ملک کے گلی کوچے غیر محفوظ ہیں۔ ہر طرف بھیڑیے غرّاتے پھرتے ہیں۔ افغان قوم کی عزت فوجی بوٹوں تلے کتنی بے دردی سے کچلی جا رہی ہے۔''

''عباس!'' سعدیہ بولی۔ ''یہ سب کچھ میرے والدین بھی جانتے تھے۔ کیا تم نہیں سوچ سکتے۔ ہمارا گھر باغیوں کی فہرست میں ہے، کیا تمہیں احساس نہیں کہ کسی وقت بھی کوئی بھیڑیا ہماری دہلیز کو پار کر سکتا تھا، کیا میری بوڑھی ماں میرا تحفظ کر سکتی تھی؟''

کیپٹن عباس نے گہری سانس لی۔ ''شاید میری سوچ ہی غلط ہو، اچھا چلو اب وقت ہو گیا ہے۔''

سعدیہ نے پرانا ٹین اور جھاڑو اٹھالی اور عباس نے کوئلوں کا بیگ اور کلہاڑا کندھوں پر رکھا۔ اور کواٹرز سے نکلے۔

برف کی سفید پھوار پڑ رہی تھی۔ ڈر سے سہمے لوگ سر جھکائے سڑکوں پر چل رہے تھے۔ انہی میں سعدیہ اور کیپٹن عباس بھی اسکول کی جانب بڑھ رہے تھے۔ عباس بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

اسکول کے سامنے ہوسٹل کا کچن اور ڈریسنگ روم تھا، جس پر روسیوں کا قبضہ

تھا۔ کچن اور مین گیٹ کے درمیان اسمبلی گراؤنڈ میں تین روسی آفیسر چمڑے کے مخصوص اوورکوٹ پہنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ سعدیہ نے کچن کی دیوار کے ساتھ ٹین رکھا اور جھاڑو سے بکھرے ہوئے پتے صاف کرنے لگی۔

''اے کون ہو؟'' ایک افسر نے پشتو میں پکارا اور سعدیہ جیسے چونک کر سہم گئی۔

''ادھر آؤ!'' افسر نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سعدیہ نے جھاڑو بغل میں دبائی اور ان کے سامنے جا کھڑی ہوگئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''مم...... میں......۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''جناب میں اسکول کی خاکروب ہوں۔''

''نزدیک آؤ!'' کمانڈر پوپوف کی بٹن نما آنکھیں چمک اٹھیں۔ سعدیہ لڑکھڑاتی ہوئی کمانڈر کے نزدیک ہوگئی۔ پوپوف نے غور سے اُسے دیکھا اور ایک افسر کو مخاطب کیا۔ ''لڑکی کو میرے کمرے میں پہنچا دو۔ میرا کمرہ بہت گندہ ہے۔ صاف کرو، تمہیں انعام ملے گا۔ جاؤ۔''

''ب...... بہت اچھا جناب!'' سعدیہ ہکلاتی ہوئی پلٹی۔ عین اسی لمحے کیپٹن عباس بھی وہاں پہنچ گیا۔

''سلام جناب!'' عباس نے ہاتھ پیشانی پر رکھ کر سلام کیا۔ ہیڈ مسٹریس

نے کوئلے بھیجے ہیں۔ جناب! بہت سردی ہے۔ انھوں نے سلام بھی کہا ہے جناب!''

تم بھی اسکول کے ملازم ہو؟'' کمانڈر پوپوف نے پوچھا۔

''جی جناب!'' عباس کی آواز سے بے خوفی عیاں تھی۔'' اسکول کا چوکیدار اور جناب کا خادم۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟'' پوپوف نے سوال کیا۔

''خستہ گل جناب!''

''اے خستہ گل جلدی کرو! کمانڈر کپ بورڈ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آگ جلاؤ، لڑکی کو سردی لگ رہی ہے۔'' اس نے کپ بورڈ کا ایک کواڑ کھولا۔ اندر لڑکیوں کی ہوم ورک کی کاپیوں کے ساتھ شراب کی بوتلوں کی قطار تھی۔ سعدیہ نے قدموں کی چاپ دبانے کی بالکل احتیاط نہ کی اور اس کے قریب پہنچ گئی۔ پوپوف نے مسکرا کر دائیں کندھے کے اوپر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کمانڈر! سعدیہ نے بدلے ہوئے سرد اور سفّاک لہجے میں شستہ زبان میں کہا۔ ہینڈس اپ! تم پلٹ کر دیکھنے کی حماقت نہیں کرو گے۔''

پوپوف کا بدن ساکت ہو گیا۔ سعدیہ نے جان بوجھ کر عباس کو رینک سے مخاطب کیا۔ ''کیپٹن! تم کمانڈر کی یونیفارم پہن لو!''

عباس تو پہلے ہی کرسی پر پڑا اوور کوٹ اٹھا چکا تھا۔

''پیچھے ہٹو سرخ سئور!'' سعدیہ نے پوپوف کی پنڈلی پر ٹھوکر ماری۔ خبردار! کوئی غلط حرکت تمہیں مہنگی پڑے گی۔ ہم تمہیں ماریں گے نہیں، بشرطیکہ تعاون کرو۔''

''سنو کامریڈ!'' پوپوف نے لجاجت کے انداز میں کہا۔ ''اس لڑکی کو سمجھاؤ، ہم افغان عوام کے دشمن نہیں ہیں۔ ہم تو بیرونی مداخلت روکنے آئے ہیں۔ ہمیں تمہارے صدر نے بلایا ہے۔ ہم یہاں امن اور جمہوریت کی بحالی کے لئے آئے ہیں۔''

بالکل نئی خبر ہے۔'' عباس نے کوٹ کی زِپ اوپر کی۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ اگر بھیڑیا جنگل کے بے ضرر اور امن پسند جانوروں کے سامنے تقریر کرے کہ میرے دانتوں میں زندگی کا پیغام ہے، تو کیا جانور یقین کرلیں گے؟'' عباس مضبوط قدموں سے چلتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ ''جمہوریت کی باتیں کر رہے ہو؟ تم امن اور جمہوریت کا وہی بیج یہاں بونے آئے ہو، جو ہنگری اور چیکوسلواکیہ میں بو چکے ہو۔ مگر یہ غیّور افغان قوم ہے۔ میں حیران ہوں۔ فیصلہ کرنے سے پہلے تمہارے بڑوں نے برطانیہ کے مؤرخوں اور مفکّروں سے مشورہ کیوں نہیں کیا؟ برطانیہ بھی یہاں ایسا ہی پودا لگانے آیا تھا۔''

''یہ تقریر کا وقت نہیں کیپٹن اپنا کام کرو۔'' سعدیہ سرد آواز میں بولی۔

''تمہارے نائب کا کیا نام ہے؟'' عباس نے پوچھا۔

''نائب کمانڈر میں ہوں۔'' پوپوف نے جواب دیا۔ ''ہمارا چیف

سکریٹریٹ گیا ہے۔''

''ہم تمہارے جوانوں تک اپنے کمانڈر کا ایک پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔''

سعدیہ بولی۔''اسے تم اپیل بھی کہہ سکتے ہو۔سب کو ہال میں بلاؤ۔''

''ٹیلی فون سیٹ اِدھر لے آؤ۔'' پوپوف نے کرسی پر بیٹھے ہوئے خود بخود ہاتھ نیچے گرادیئے۔

عباس نے فیلڈ سیٹ اٹھا کر اس کے سامنے رکھا ابھی وہ سیدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ پوپوف کرسی سے اچھلا۔ پاؤں کی ضرب لگانے کے لئے اس نے عباس کے چہرے اور سعدیہ کے پیٹ کا نشانہ لیا۔لیکن دونوں ہی پیچھے ہٹ گئے۔ پوپوف نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور ساتھ ہی سعدیہ کے ریوالور سے خاموش شعلے نکلے۔ پوپوف فٹ میٹ پر اوندھے منہ گر پڑا۔

چلو جلدی کرو، طریقہ نمبر دو!'' سعدیہ پوپوف کا تڑپتا ہوا جسم گھسیٹتے ہوئے بولی۔ اور عباس اوورکوٹ کی ٹوپی پیشانی پر جھکائے باہر نکل گیا۔سعدیہ نے پوپوف کی جیب سے شناختی کارڈ اور سرخ ڈائری نکالی اور اس کی لاش پلنگ کے نیچے چھپادی۔

باہر وسل کی آواز کے ساتھ ہلچل سی مچ گئی۔ سعدیہ کوئلوں کے تھیلے سے دستی بم نکال کر ٹین میں رکھ رہی تھی۔ دستی بم ٹین میں منتقل کرنے کے بعد اس نے مشین گن کے حصے جوڑے اور دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ سردی کے

باوجود اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے تھے۔ باہر ستون کی آڑ میں عباس کھڑا تھا۔ اور روسی قطاروں میں ہال کی جانب جا رہے تھے۔ اس نے ٹین کندھے پر رکھا اور مشین اونی چادر کے نیچے چھپا کر باہر نکل گئی۔ وہ برآمدے سے اتر کر روش پر چلنے لگی۔ عباس نے بھی اس کے متوازی برآمدے میں قدم بڑھائے۔ دونوں ہال کے آخری دروازے کے قریب جا کر ایک لمحے کے لئے ملے اور پھر جدا ہو گئے۔ سعدیہ نے ایک پٹہ مشین گن پر چڑھا لیا۔

کیپٹن نے اللہ کا نام لیکر دو دستی بم ٹین سے نکالے اور دانتوں سے سیفٹی پن کھینچ لئے۔ پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ نیم وا کر کے اس نے ایک بم اگلے حصے میں اور دوسرا سامنے اچھال دیا اور خود اچھل کر ستون کی آڑ میں چلا گیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی دو دھماکے ہوئے۔ کیپٹن عباس کے ہاتھوں میں دو اور بم آ چکے تھے۔ سعدیہ کی مشین گن بھی شعلے اگلنے لگی۔

''کیپٹن......!'' سعدیہ نے چیخ کر کہا۔ عباس نے سعدیہ کی طرف دیکھا اور سعدیہ کی روح تک لرز اٹھی۔ کیپٹن کا چہرہ خون میں بھیگا ہوا تھا۔ سعدیہ نے کیپٹن کو کندھے پر ڈالا اور بدحواس روسی فوجیوں کے درمیان دوڑنے لگی۔

''میں ٹھیک ہوں سعدیہ!'' کیپٹن نے سعدیہ کے کان میں سرگوشی کی۔ ''مجھے اتار دو۔''

''ابھی نہیں، میں تمہاری آڑ میں ہوں۔ ہمیں اسی افراتفری میں یہاں سے

نکل جانا ہوگا۔'' سعدیہ نے کہا۔

☆

دونوں نے پختہ سڑک عبور کی تو مشرق شفق کی لالی سے مسکرانے لگا تھا اور نیچے نالہ غلزئی کے قرب و جوار میں گھمسان کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ کیپٹن عباس نے ٹیکری کی چوٹی پر رک کر دوربین سے نیچے دیکھا۔

''کوئی آرہا ہے کیپٹن!'' سعدیہ نے سرگوشی میں بتایا۔''میں نے پتھر لڑھکنے کی آواز سنی ہے۔''

''جھاڑیوں کی اوٹ لے لو۔'' کیپٹن نے کہا۔''یہ روسی بھگوڑے بھی ہو سکتے ہیں۔'' دونوں ہی جھک کر جھاڑیوں میں داخل ہوگئے۔

ایک سایہ چڑھائی کر اوپر آیا اور ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھ گیا۔''روسی نہیں ہو سکتا'' سعدیہ بولی۔ کیپٹن عباس نے چھوٹا سا پتھر اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیا۔

''کون ہے؟'' کیپٹن عباس نے پکارا اور وہ پتھر کی آڑ سے باہر نکل آیا۔

''میں احمد ہوں۔'' اس نے کہا۔ سعدیہ اور عباس جھاڑیوں سے نکل کر دوڑتے ہوئے احمد کے قریب پہنچ گئے۔

''میں اچھی خبر نہیں لایا کیپٹن۔'' احمد کی آواز افسردگی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہمارے ٹھکانے پر چھاپہ مارا گیا ہے۔ ہم سب پوسٹوں پر تھے۔ اندر صرف میجر قدیر ہی تھے۔''

''بولتے رہو احمد!'' کیپٹن عباس نے مضبوط اور ٹھہرے انداز میں کہا۔ کیا میرے بابا شہید ہو گئے ہیں؟''

''نہیں......'' احمد بتایا۔ ''ان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔''

''اوہ!'' کیپٹن نے طویل سانس لی۔ ''چھاپے کی قیادت کون کر رہا تھا؟''

''کرنل شمروز۔'' احمد نے کہا۔ ''سب لوگ بکھر گئے تھے۔ کیونکہ مقابلہ ایک اور پچاس کا تھا۔''

''سعدیہ......!'' کیپٹن عباس بولا۔ ''تم اور احمد باقی لوگوں کو تلاش کر کے دوسرے ٹھکانے پر جمع ہو جاؤ۔''

''ہم آپ کے ساتھ رہیں گے کیپٹن!'' احمد نے پُر جوش آواز میں کہا۔

''نہیں۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔ شہروں میں طاقت کی نہیں، سیاست اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بابا کو ہم لڑ کر آزاد نہیں کرا سکتے۔ مجھے تنہا کچھ کرنے دو''

''میں تمہیں روکوں گی نہیں عباس!'' سعدیہ ٹھہرے انداز میں بولی۔ میجر قدیر تمہارے ہی باپ نہیں۔ بلکہ تمام مجاہدین کے باپ ہیں۔ ان کی گرفتاری کوئی معمولی نقصان نہیں۔ میری درخواست ہے کہ مجھے بھی اس کوشش میں حصہ لینے دو۔''

''میں تمہیں ساتھ نہیں رکھ سکتا سعدیہ!'' عباس نے کہا۔ ''مجھے شاید آگ

اور خون کا سمندر عبور کرنا پڑے۔''

''میں ضد بھی نہیں کروں گی۔ لیکن کچھ مدد کر سکتی ہوں۔ کرنل شمروز کے گھرانے سے ہمارے گہرے مراسم ہیں۔ بیگم شمروز کے نزدیک میں اب بھی ایک ملٹری آفیسر کی بیٹی ہوں۔'' ''پھر تو بلاشبہ مدد کر سکتی ہو۔'' عباس نے کہا۔

''سنو احمد! اب تم تنہا ساتھیوں کو تلاش کرو۔ سعدیہ میرے ساتھ جائیں گی۔''

بہت دنوں بعد آسمان صاف ہوا تھا۔ روپہلی دھوپ بگرام کے درودیوار پر اتر رہی تھی۔ بازار میں ابھی اکّا دکّا دکانیں ہی کھلی تھیں۔ کچھ مزدور کدالیں اور بیلچے کندھوں پر رکھے چھاؤنی ایریا کو جانے والے سڑک پر جا رہے تھے اور انہیں میں عباس اور سعدیہ بھی تھے۔ چڑھائی کے اختتام پر وہ دونوں بزازی کی ایک دکان میں داخل ہو گئے۔ اندر جا کر عباس نے چادر کی اوٹ سے چہرہ نکالا تو دکان دار اچھل کر کھڑا ہو گیا اور خوش ہو کر بولا۔ ''عباس!''

''بیٹھ جاؤ عباس، اور جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ ڈالو۔'' دکان دار نے کہا۔

''ہمیں ایک گاڑی کی ضرورت ہے ماجد، اور ریوالور کی کچھ گولیاں بھی۔''

''تمہاری جیپ نوروز آٹو ورکشاپ میں بھیس بدل کر کھڑی ہے۔ یہ کارڈ ول شیر کو دکھانا۔ وہ تمہارے والے کر دے گا۔'' ماجد نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے کارڈ نکالا اور عباس کو دیا۔ ''ضرورت کی ہر شے بھی تمہیں مل جائے گی۔''

''عوامی جذبات کیا ہیں ماجد؟''

''ابھی گیلی لکڑیاں سلگ رہی ہیں۔'' ماجد بولا۔ ''دھواں اٹھ رہا ہے۔ امید ہے عنقریب ہی شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ آج چار بجے گرلز اسکول کے شرمناک سانحے کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکل رہا ہے۔ لڑکیاں گھر گھر جا کر لوگوں کو بتا رہی ہیں۔ شہر کی مائیں جلوس کی قیادت کر رہی ہیں۔''

''شاباش بڑھتے چلو! منزل دور نہیں۔ جس قوم کی مائیں بیدار ہو جاتی ہیں اس کی قسمت کو کوئی گہری نیند نہیں سلا سکتا۔ یہ بھی تمہاری ایک بہن ہے جو گوریلوں کے دوش بدوش محاذوں پر لڑ رہی ہے۔'' عباس نے سعدیہ کی طرف اشارہ کیا۔

ماجد نے اٹھ کر سعدیہ کی تعظیم کی۔ عباس نے کارڈ جیب میں ڈالا اور وہ دونوں دکان سے باہر نکل گئے۔

آفیسرز کالونی کی ایک کشادہ کوٹھی کے سامنے جیپ رکی۔ اور عباس اور سعدیہ اتر کر گیٹ میں داخل ہو گئے۔ سعدیہ پڑھی لکھی لڑکیوں کا روایتی لباس پہنے ہوئے تھی اور کیپٹن بھی واسکٹ اور اونی ٹوپی میں بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔

پہرے پر کھڑا افغان آرمی کا سپاہی بولا: ''خبردار! وہیں رک جاؤ۔''

''ہش نمک حرام!'' سعدیہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''چلو آگے ہٹو۔ ورنہ خالہ جان سے شکایت کر دوں گی۔''

''سعدیہ بی بی! مادام ہی کا حکم ہے۔'' سنتری گھبرا کر ایک طرف ہٹ گیا

اور سعدیہ عباس کا ہاتھ تھامے سیڑھیاں چڑھنے لگی اور برآمدے میں جا کر کال بیل بٹن دبایا۔.................. ''کون؟'' اندر سے آواز آئی۔

''میں سعدیہ یوسف ہوں خالہ جان!'' سعدیہ نے جواب دیا اور فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

''آؤ بیٹی!'' شمروز بیگم نے گرم جوشی سے کہا۔ ''اور کون آ رہا ہے؟''

''میرے کزن ادریس۔'' سعدیہ نے جان بوجھ کر عباس کا نام چھپالیا۔

''اے! بیگم شمروز نے باہر جھانک کر سنتری کو پکارا۔ ''مہمان کے لئے ڈرائنگ روم کھول دو۔ تم اندر آ جاؤ سعدیہ۔'' سعدیہ نے پلٹ کر کیپٹن عباس کو دیکھا اور پھر اندر چلی گئی۔

''مہروز کہاں ہے خالہ جان!'' سعدیہ نے پوچھا۔

''اندر پڑھ رہی ہے۔'' بیگم شمروز نے دوڑ کر سعدیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''وہ پڑھ رہی ہے۔'' .... ''میں مہروز سے مل آؤں۔''

''اوہ ......نن......نہیں!'' بیگم شمروز نے دوڑ کر سعدیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''وہ پڑھ رہی ہے۔ اسے پڑھنے دو۔''

سعدیہ مسکرانے لگی۔ کیا ماں کی طرح باپ بھی اس تلخ حقیقت سے واقف ہے؟''

''تم......!'' بیگم شمروز چونک کر بولی۔ ''زخم پر نمک چھڑ کنے آئی ہو۔''

''زخم......!'' سعدیہ نے قہقہہ لگایا۔ ''بے غیرتوں کے احساسات بھی زخمی ہوا کرتے ہیں کہیں؟''

''خاموش!'' بیگم دہاڑی۔ شمروز کچھ نہیں جانتا۔ اسے یہی بتایا گیا ہے کہ بچی غیر ملکی فوجوں سے دہشت زدہ ہوکر بے ہوش ہوگئی تھی۔ یہ ہمارے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ یہ ہماری بچی کے مستقبل کا مسئلہ ہے سعدیہ۔ براہِ کرم اپنی زبان بند رکھو۔''

''کیا میری قوم کی مائیں بھی بے غیرت ہوگئی ہیں؟'' سعدیہ غرّائی۔ خالہ تم نے یہ ظلم کتنی خاموشی سے برداشت کرلیا ہے۔ تم ماں ہو۔ تمہیں تو چیخ چیخ کر اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنا چاہئے تھا۔ تمہیں ایک ماں کی چیخوں، اور ایک معصوم بیٹی کے خون آلود دامن سے دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر جگانا چاہئے تھا۔ لیکن تم نے شاید بیٹی کو بھی اپنی عصمت کی موت پر آنسو بہانے سے روک دیا ہوگا۔ کرنل شمروز بے غیرت سہی، وہ ایک باپ ہے۔ اس کی رگوں میں افغان ماں کا خون ہے تم نے اسے بتایا ہوتا۔ شاید باپ کی غیرت اور افغانی خون ہوش سے کھول اٹھتا۔

''خاموش!'' بیگم شمروز نے اچھل کر سعدیہ کے منہ پر تھپّڑ مارا۔ ''نکل جاؤ یہاں سے!''

سعدیہ گال پر ہاتھ رکھ کر بیگم شمروز کو گھورنے لگی اور پھر اس کے لبوں پر

سفاک مسکراہٹ ابھری۔ بیگم شمروز سحر زدہ حالت میں بالکل ساکت کھڑی تھی۔ جب سعدیہ نے جوڈو کا انداز اختیار کرتے ہوئے جسم کو تولا اور دایاں ہاتھ اٹھایا تب بھی بیگم شمروز کے جسم میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ وہ سعدیہ میں ڈوبی کھڑی رہی۔ سعدیہ نے کڑی ہتھیلی کی آزمودہ ضرب اس کی گردن پر لگائی اور پھر لپک کر اسے سنبھال بھی لیا۔ قالین پر بیگم شمروز کو لٹا کر جیسے ہی وہ سیدھی ہوئی اندر کی جانب کھلنے والا دروازہ چرچرایا۔ سعدیہ کسی زخمی شیرنی کی مانند غرّاتی ہوئی پلٹی۔ نیم وا دروازے سے مہروز کا سنہری چہرہ جھانک رہا تھا۔ ''اندر آ جایئے باجی۔'' مہروز بولی۔ ''میں سب کچھ سن چکی ہوں۔''

سعدیہ اندر داخل ہو گئی۔ ''مہری!'' اس کی آواز جذبات سے لرزنے لگی۔ میری بہن!'' میں نے تیری مظلومیت کا ان درندوں سے انتقام لے لیا ہے۔''

''مم...... مجھے۔'' مہروز کپکپاتی آواز میں بولی۔ اور پھر چیخ کر سعدیہ سے لپٹ گئی۔ ''مجھے تباہ کر دیا گیا ہے سعدیہ بہن! میں مرنا چاہتی تھی۔ لیکن مادر نامہربان نے مجھے مرنے بھی نہیں دیا۔ داغ دار چہرے اور پھٹے ہوئے دامن کے ساتھ میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔'' مہروز بلک رہی تھی۔ سعدیہ اس کے بالوں پر چہرہ رگڑنے لگی۔ تم بے گناہ ہو مہری۔'' سعدیہ نے اس کا چہرہ ہتھیلیوں کے پیالے میں تھام کر کہا۔ تمہارا دامن پاک ہے۔ تمہیں جینا ہوگا۔ اپنے لئے اور اپنی

قوم کے لئے۔ وہ درندے آج بھی ہماری دھرتی پر موجود ہیں۔ ان کے ہاتھ اب بھی قوم کی ماؤں اور بہنوں اور بیٹیوں کے دامن تار تار کر رہے ہیں۔ آنسو پوچھ ڈالو میری بہن اور میرے سامنے اپنے رب سے عہد کرو کہ تم جنگِ آزادی میں ایک جاں فروش مجاہدہ بن کر وطن عزیز کے دشمنوں سے لڑو گی۔''

مہروز سسک کر بولی۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں، میں وعدہ کرتی ہوں۔''

سعدیہ نے اس کی روشن پیشانی چوم لی۔

''اب ایک مجاہدہ کی طرح ایک مجاہد عظیم کی مدد کرو۔ میجر قدیر کو تمہارے پاپا گرفتار کر لائے ہیں۔ ان کی رہائی بے حد ضروری ہے کیا تم تعاون کرو گی مہروز؟''

''دل و جان سے۔'' مہروز نے پُرعزم آواز میں جواب دیا۔ ''مجھے بتایئے میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''ہم ایک ڈرامہ کھیلیں گے مہری!'' سعدیہ نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کرنل صاحب شاہ روز اور تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ہم تمہیں یرغمال بنا لیں گے۔ تم ٹیلی فون پر تصدیق کرتے ہوئے اپنے پاپا سے اپنی اور چھوٹے بھائی کی زندگی کی بھیک مانگو گی۔ پھر ہم کرنل سے میجر قدیر کی رہائی کا مطالبہ کریں گے۔ اگر میجر قدیر کو یہاں لایا گیا تو بھی ہم اپنی سلامتی کی ضمانت کے طور پر تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کیا تم بھروسہ کرو گی؟''

مہروز بولی۔ ’’میں آپ کی اسکیم سمجھ رہی ہوں باجی۔‘‘

’’جزاک اللہ مہری!......اب آؤ کھیل شروع کریں۔‘‘

سعدیہ ٹیلی فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ مہروز نے خود کرنل شمروز کا نمبر ملایا اور جب رابطہ قائم ہو گیا تو اس نے ریسیور سعدیہ کی جانب بڑھا دیا۔

’’کرنل! میں تمہاری بیٹی مہروز کے بیڈروم سے بول رہی ہوں۔ بخیریت؟‘‘ سعدیہ نے قہقہہ لگایا۔ ایک لڑکی کے پاس ایک گوہر ہوتا ہے کرنل، جسے عصمت کا نام دیا گیا ہے۔ جب وہ گوہر چھن جائے تو لڑکی کے پاس سوائے آنسوؤں کے کچھ نہیں رہتا اور تمہاری بیٹی کے پاس تو یہ ذخیرہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ خیر، چھوڑو تمہیں یقیناً فخر ہو گا کہ تمہاری بیٹی کے دامن سے یہ گوہر چرانے والے تمہارے آقا ہیں۔ ایک سپر پاور کے لوگ۔ کیوں ہے نا باعث فخر بات؟‘‘

’’بند کرو یہ بکواس!‘‘ کرنل دہاڑا۔

سعدیہ نے پرسکون آواز میں کہا۔ اور سنو، تمہارا بیٹا شاہ روز اور مہروز ہمارے سامنے بیٹھے ہیں اور میرے ریوالور میں سیسے کی گرم گرم کئی ٹافیاں ہیں جو یقیناً ان پیارے بچوں کو ناپسند ہوں گی......اوہ......ہمیں پہچانا نہیں۔ کمال ہے کرنل! روسیوں کے دوست ہو کر اتنے بھولے بن رہے ہو، ہاں بفضلِ خدا ہم حریت پسند ہیں۔ چاہتے کیا ہیں......تمہارے ان بچوں کی خیریت......اور میجر قدیر کی واپسی...... کیوں! خاموش کیوں ہو گئے ہو کرنل؟ کوئی حکم جاری کر رہے

ہو، تو یہ بھی سوچ لینا شاہ روز کے ننھے حلق میں گرم گولی بڑی اذیت ناک ہوگی۔ ارے نادان کرنل! ہم تو کفن ساتھ لئے پھرتے ہیں، ہمیں موت کیا ڈرائے گی۔ آپ ایسا کریں خود تشریف لائیں۔ کیونکہ بچے آپ کے ہیں۔ دوسروں کو کیا درد ہوگا۔ وہ اپنے آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر کوئی حماقت بھی کر سکتے ہیں۔ بالکل سیدھا سا لین دین کا طریقہ ہوگا۔ میجر کو ساتھ لے آؤ۔ ہمارے حوالے کرو اور اپنے بچے لے لو۔ نہیں کرنل اب ہم اتنے زخم کھا کر بیوقوف نہیں بن سکتے۔ بچے اور تم ہماری گاڑی میں رہو گے۔ ہم کسی بھی محفوظ مقام پر تمہیں اتار دیں گے۔ ٹھیک ہے لیکن ہم ایسے بے غیرت شخص پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ جس نے غیروں کے لئے اپنے گھر کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ چاہو تو مہروز سے بات کر سکتے ہو۔" بات ختم کر کے سعدیہ نے ریسیور مہروز کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"پاپا" مہروز کچھ تو پہلے کی روئی تھی اور پھر رونے کی اداکاری بھی کر رہی تھی۔ہمیں بچا لیجئے پاپا! ممی بے ہوش پڑی ہیں۔ شاہ روز کی کنپٹی پر ریوالور کی نالی ہے۔ وہ بہت سہما ہوا ہے پاپا۔ میں نے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ ان کا مطالبہ پورا کر دیں۔ شکریہ پاپا! مہروز نے ریسیور واپس سعدیہ کو دے دیا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ "ہیلو کرنل! اور کسی تصدیق و تائید کی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے ہم منتظر ہیں یاد رکھنا ہماری آنکھیں اور کان کوٹھی کے باہر بھی ہیں تمہاری کسی بھی ہوشیاری کی اطلاع پاتے ہی ہم تمہارے خاندان کا نشان

مٹا کر نکل جائیں گے۔ ماسکو کے پٹھو نہیں، ایک باپ بن کر آؤ۔"

سعدیہ نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر بیگم شمروز کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

☆

سیاہ اسٹاف کار جب پارکنگ الاٹ میں آ کر رکی تو سعدیہ کھڑکی کا پردہ اٹھائے باہر دیکھ رہی تھی۔ کار سے پہلے کرنل شمروز کود کر نکلا اور پھر اس نے پچھلا دروازہ کھول کر میجر قدیر کو گھسیٹ کر نیچے گرایا۔ میجر قدیر اوندھے منہ زمین پر گرے اور سعدیہ نے پردے کو مسل کر اپنے کھولتے ہوئے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ کرنل نے جھک کر میجر کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور پھر گھسیٹتا ہوا چل پڑا۔

"کیپٹن!" سعدیہ نے پلٹ کر کہا۔ "میجر کی حالت خراب ہے ہمیں ان کو یہاں سے جلد از جلد نکالنا ہے اپنے جذبات پر قابو رکھنا۔"

سعدیہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ "اوہ...... تم سعدیہ!" کرنل شمروز غرّایا۔

"جی!" سعدیہ ایک طرف ہوگئی۔ میجر کو گاڑی میں ہی رہنے دیتے۔"

"پاپا!" مہروز اپنے باپ کو دیکھ کر رونے لگی۔ عباس نے ننھے شاہ روز کو بانہوں میں دبا رکھا تھا اور ریوالور کی نال مہروز کی پشت سے لگی تھی۔

"پیچھے ہٹ جاؤ! کرنل دہاڑا۔ "تمہارا مطالبہ پورا کر دیا گیا ہے۔"

''میں تمہارا بیٹا اور مہروز کا دینی بھائی ہوں کرنل! مجھ پر غصہ بے محل ہے۔'' کیپٹن عباس بولا۔ لیکن وہ بھیڑیئے جب قوم کی بیٹیوں کی بوٹیاں نوچ رہے تھے اس وقت تمہاری غیرت کہاں سوئی ہوئی تھی؟''

''خاموش!'' کرنل مٹھیاں بھینچ کر دہاڑا۔ ''بکواس بند کرو۔''

''بڑے ہی بے غیرت باپ اور ننگِ وطن ہو کرنل! کیپٹن عباس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ تم خواب دیکھ رہے ہو۔'' اس کی تعبیر بڑی بھیانک ہوگی۔ آگے جانے اور موت کی غار میں گرنے والوں کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے۔ کبھی کوئی غدّار پھل پھول نہیں سکا۔ غداروں کی فہرست میں نام بہت کم ہیں۔ گھاٹے کا سودا کیوں کر رہے ہو؟ سرفروشوں کی جگمگاتی فہرست کی طرف لوٹ آؤ۔ کیا تم اپنی اس معصوم بیٹی کی عصمت کے عوض جنرل بننا چاہتے ہو؟ مہروز اپنے باپ کو ظلم کی داستان سناؤ! اسے اپنا خون آلود دامن دکھاؤ۔ شاید اس کے آباء واجداد کا خون رگوں میں کھول اٹھے۔ سنو کرنل! اسکول کی ان معصوم اور ستم رسیدہ بچیوں میں تمہاری مہروز بھی شامل تھی۔''

''نن...... نہیں...... نہیں......!'' کرنل لڑکھڑا کر چیخا۔ ''یہ جھوٹ ہے، یہ جھوٹ ہے۔''

''یہ سچ ہے پاپا!'' مہروز کی چیخیں نکل گئیں۔ ''میں، میں آپ سے نفرت

کرتی ہوں۔ تھو!"

"مہر......روز!" کرنل نے لڑکھڑا کر دیوار تھام لی۔ تم نے تم نے مجھے۔ مجھے......"

"جاگو جاگو عمِ محترم!" سعدیہ نے بھرپور ضرب لگائی۔ "اپنی بیٹی کے دامن چاک چاک کے لئے جاگو!"

"بس......بس کرو!" کرنل سسکنے لگا۔ "لے جاؤ میجر کو اپنے ساتھ۔"

"چلو عباس!" سعدیہ بولی۔ ان سب کو گاڑی میں منتقل کر دو۔"

"کرنل!" عباس نے شاہ روم کو سعدیہ کی بانہوں میں دیتے ہوئے کہا۔ "تم ساتھ چلو گے یا تمہارے گارڈ کو لے جائیں؟"

"سب کو ساتھ لے جاؤ۔" کرنل نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کا سرخ چہرہ پسینے میں ڈوب چکا تھا۔ "کل یہ کوٹھی ایک باغی اور بھگوڑے کرنل کی ہو گی۔"

"اللہ اکبر!" میجر قدیر لڑکھڑاتا ہوا اندر آ گیا۔ سنو کرنل شمروز! اگر تمہارا فیصلہ عارضی نہیں تو ہمیں صرف ایک کرنل کی نہیں بلکہ اس کے پورے بریگیڈ کی ضرورت ہے۔"

"وقت ہی میرے فیصلے کی تصدیق کرے گا میجر! کرنل مضبوط لہجے میں بولا۔ "کل شام کا سورج اس وقت ڈوبے گا جب میں بگرام کو روسیوں کے خون سے تر کر چکا ہوں گا۔ جاؤ میجر! میرا خاندان اب تمہاری حفاظت میں رہے گا۔"

''نہیں کرنل!'' میجر نے کہا۔ مجھ پر یہ گراں بوجھ نہ ڈالو۔ ہم سب خاندان سے کٹ کر باہر نکلے ہیں۔ تم اپنے خاندان کو کسی محفوظ جگہ منتقل کر دو۔ آؤ بچو۔ اب ہمیں کرنل پر بھروسہ کرنا چاہئے۔''

''ٹھہریئے میجر!'' کرنل بولا۔ راستوں کی ناکہ بندی کی جا چکی ہے۔ کل اسکول پر گوریلوں کے حملے نے روسیوں کی کمر توڑ دی ہے۔ بگرام اس وقت ان کے محاصرے میں ہے۔ مہروز اور شاہ روز دونوں کو ساتھ لے چلئے۔ میں اسٹاف کار خود ڈرائیو کروں گا۔''

''شکریہ کرنل!'' میجر قدیر کے پھٹے ہوئے خون آلود ہونٹ مسکرانے لگے۔

شہر سے آٹھ میل دور مشرقی پہاڑیوں کی وادی میں پہنچ کر میجر قدیر نے اسٹاف کار روکنے کو کہا۔ اور کار رک گئی۔ تو سعدیہ اور عباس نے تھام کر میجر کو نیچے اتارا۔ کیپٹن عباس جان بوجھ کر نگاہیں اِدھر اُدھر چرا رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کا کٹا پھٹا جسم دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میجر قدیر اس حالت میں بھی بے مثال حوصلے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''جزاک اللہ مہری۔'' سعدیہ نے قریب کھڑی مہروز کو سینے سے لگالیا۔ ہم انشاء اللہ پھر ملیں گے۔'' مہروز بولی۔ ''میں واپس نہیں جاؤں گی۔ میں باجی سعدیہ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کی اجازت چاہوں گی پاپا!''

''میجر قدیر! کرنل نے چہرہ باہر نکال کر کہا۔ میرے خون کا یہ حقیر سا نذرانہ

قبول کرلو۔"

"ہاں کرنل۔" میجر نے مہروز کو پہلو کے ساتھ لگا لیا۔ یہ درخشندہ ستارے ہی تو قوم پر چھائی ہوئی تاریکیوں کو روشنی دیں گے۔"

"خدا حافظ! میرے بچو! کرنل نے ہاتھ باہر نکال کر لہرایا۔ مہروز نے جھک کر باپ کے ہاتھ تھامے اور آنکھوں اور ہونٹوں سے لگا لئے۔"

☆☆☆

خطرناک سازش

کابل سے جو سڑک بنڈ روال جاتی ہے اس سڑک کے کنارے بائیس تیئیس سال کی ایک نوجوان لڑکی نے دو تین پتھر رکھ کر چولہا سا بنا لیا۔ اس چولہے پر ایک برتن رکھا۔ برتن کے نیچے گھاس اور پتّوں کو سُلگا کر وہ گیلی لکڑیاں جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پاس ہی ستّائیس اٹھائیس سال کا ایک نوجوان ملی جلی گیلی سوکھی گھاس اور پتیوں پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ سینے پر تھا۔ وہ بار بار اپنا سینہ دباتا۔ بنڈ روالن کو گالی دیتا اور کبھی کبھی پتھر پھینک مارتا اور کہتا۔ "غنڈی جلدی لا۔"

بندروالن بیچاری اپنی جیسی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن وہ کرتی بھی تو کیا کرتی۔

ماچس سے سلائیاں نکال نکال کر پھونک رہی تھی۔ لیکن گیلی لکڑیوں کو جلانا آسان نہیں۔ ایک بار بڑا سا پتھر اس کے سر پر لگا تو وہ بھی غرّا گئی۔ اس نے برابر کا جواب دیا۔ ''غنڈے دیکھتا نہیں۔ کوشش تو کر رہی ہوں۔'' اور پھر اسے نوجوان پر پیار آ گیا۔ ''پارے! ابھی لاتی ہوں۔''

بندروالن اس کے پاس گئی۔ اچانک بندروالن چونکی۔ وہ دوڑ کر چولھے کے پاس پہنچی اور پھر ماچس کی تیلیاں گھس گھس کر پھینکنے لگی۔ اس کی ناک سے رطوبت نکل رہی تھی اور دھویں کے لگنے سے آنسو بھی نکل رہے تھے۔ وہ آنسو اور رطوبت بار بار پونچھ رہی تھی۔ بندروال اب سینے کے درد کے مارے ہائے واویلا کر رہا تھا اور بلند آواز سے بندروالن کو گالیاں دینے لگا تھا۔

اتنے میں ایک کار ان کے پاس ہی آ کر رکی۔ پھر دوسری، پھر تیسری۔ تیسری کار تو اس میں سے پہلے ایک شخص نے جھانک کر بندروالوں کو دیکھا۔ پھر باہر آیا۔ اس کے باہر آتے ہی تینوں کاروں کے لوگ اتر پڑے۔ یہ سب فوجی لباس میں تھے۔ پہلا شخص جو بندروالوں کے پاس پہنچ چکا تھا کوئی بڑا افسر لگتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بندروالن نے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور ادب سے کھڑی ہو گئی۔

''سرکار! ہم بندروال ہیں۔ ہمارے قبیلے کے لوگ آپ کے وفادار ہیں۔ یہ میرا شوہر گلزار ہے۔ اس کے سینے میں بیماری ہے۔ میں اسے اسپتال لے جا رہی ہوں۔ آپ اپنے وفاداروں کے قدردان ہیں۔ میں آپ سے مدد کی

طلب گار ہوں۔''

بندروالن ادب کے ساتھ سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔فوجی افسر اسے غور سے دیکھتا رہا۔پھر اس نے بندروال کو دیکھا۔وہ اب بھی گالی بک رہا تھا۔

''کیا تو اپنی بیوی کو پسند نہیں کرتا،فوجی افسر نے گلزار سے پوچھا۔

''او بائی سرکار لوگ! اَم اِس غنڈی کو بوَت چاہتا۔ میں اس سے کیتا۔ ''امارے دل میں درد ہے۔ یہ آمارا مطلب نئیں سمستا۔آپ اسے سمجھائیں۔ آپ دیکھئے یہ کتنا حسین ہے۔''

فوجی افسر مسکرایا۔''غنڈی! ہم تمہاری مدد کرے گا۔''

''سرکار! معافی۔میرا نام غنڈی نہیں ہے۔یہ تو گالی ہے۔میرا نام گلنار ہے۔''

''سوری۔اَچّا۔ہم تم کو اسپتال پہنچادیں گے۔''

فوجی افسر نے اپنے فوجیوں سے روسی زبان میں کچھ مشورہ کیا۔جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔پھر کہنے لگا۔

''یہ دیکھو گلنار! ایک ہزار ہے۔اسے رکھو۔ہم ابھی تم کو اسپتال پہنچائیں گے۔لیکن ایسے اسپتال پہنچائیں گے جہاں تمہاری قوم کے لوگ رہتے ہیں۔ وہاں تمہارے بندروال کا علاج بھی ہوجائے گا اور وہیں تم کو روپیہ بھی ملتا رہے گا۔جو کام تمہیں کرنا ہے وہیں معلوم ہوجائے گا۔''

گلنار نے جھک کر سلام کیا اور نوٹوں کی گڈی لے کر بندروال کو دے دی۔

فوجی افسر نے کہا۔

''ہم تم کو سرحد تک پہنچا دیں گے۔ وہاں سے تم اپنے لوگوں میں خود جاؤ گی۔ وہاں کے اسپتال میں اپنے بندروال کو داخل کر دینا۔ اور دیکھو اگر تم نے غداری کی تو تم زندہ نہیں رہ سکتے۔''

گلنار نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ فوجی افسر کے اشارے پر ڈرائیور نے ایک کار کو موڑا اور اس رخ کھڑا کر دیا جدھر سے آیا تھا۔ بندُ روالن نے بندُ روال کو سہارا دیا۔ دونوں کار میں بیٹھے۔ کار بھر بھرائی اور تیزی سے نامعلوم مقام کی طرف چل دی۔

☆

''خان بابا! آپ مجھ سے روپیہ لے لیں۔ مجھے اپنی بیٹی سمجھیں۔'' اور یہ کہہ کر نوجوان لڑکی نے سو روپیہ کا نوٹ بوڑھے بیمار کی طرف بڑھا دیا۔ ''آپ فوراً انجکشن اور دوا منگوالیں۔ ضرورت پڑے تو اور لے لیں۔

''ربُّ الارباب تیری مراد پوری کرے بیٹی! یہ نوجوان تیرا شوہر ہے نا بیٹی! بڑا حسین وجمیل ہے۔ اسے کیا بیماری ہے؟''

''بابا! کچھ نہیں۔ یہ غنڈا مکّار ہے۔ مجھ سے کہتا ہے دل کا بیمار ہوں۔ بابا! آپ سمجھے؟''

''ہاں بیٹی! جب میں جوان تھا تو مجھے بھی دل کی بیماری تھی۔ پھر میری بیماری

مرگئی۔ خدا کرے تیرے شوہر کے دل کی بیماری برقرار رہے۔"

نوجوان لڑکی مسکرا دی۔ بوڑھے نے سو روپیہ کا نوٹ لے کر اپنے لڑکے کو دے دیا۔

"بیٹی! یہ بچہ بھیک مانگ کر میرے علاج کے لئے پیسے لاتا ہے۔ اور ہاں سن لڑکی! کیا تو میری بیٹی نہیں ہے؟"

"ہوں، ضرور ہوں بابا! اب آپ میرے معصوم بھائی سے بھیک نہ منگوائیں۔"

"اچھا تو آ میرے پاس۔"

نوجوان لڑکی نے اپنے بیمار کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔ لڑکی خان بابا کے پاس گئی۔ خان بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کا سر اپنے قریب کیا اور بولا۔ "بیٹی! اب تو مجھے دوسرا روگ ہے۔"

"وہ کیا بابا!" لڑکی ہونّق ہو گئی۔

"وہ روگ ہے آزادیٔ وطن کا۔"

اسی وقت دودھ والا آ گیا۔ اس نے دودھ کی بوتل لڑکی کی طرف بڑھا دی۔ لڑکی نے اس سے کہا کہ ایک اور دے دے۔ پھر خان بابا سے کہا۔ "بابا! اب تو فیصلہ ہو گیا۔ اپنا روگ دل سے نکال دو۔"

دودھ والا ایک نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ خان بابا کہہ رہا تھا۔ "نہیں بیٹی!

یہ روگ تو اسی وقت نکلے گا جب یہ غاصب روسی کابل سے نکل جائیں گے۔''

بچہ انجکشن اور دوائیں لے آیا تھا۔ اس کے ساتھ کمپاؤنڈر بھی تھا۔ کمپاؤنڈر نے انجکشن لگایا۔ گولیاں دیں۔ ترکیبِ استعمال بتائی۔ پھر بوڑھے کی ران کے زخم کو دیکھا۔ ''بابا مندمل ہو گیا۔ اب درد تو نہیں۔''

''کاش! میرے دل پر جو زخم آیا ہے وہ کبھی اچھا نہ ہو۔''

کمپاؤنڈر چلا گیا۔ خان بابا لڑکی سے مخاطب ہوا۔

''بیٹی! تو کسی بڑے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ تیرا شوہر کس قبیلے کا ہے؟''

''بابا! ہم دونوں بندُ روال ہیں۔''

''او بابا۔ خوب! ہم بھی بندُ روال ہیں۔ بندُ روالوں کا کیا حال ہے،''

''بابا! بندُ روال پر نئی سرکار کا قبضہ ہو گیا۔ بندُ روالوں نے اطاعت قبول کر لی اور اب سب چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ بندُ روالوں کی غیرت کیا ہوئی؟ غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالنے سے پہلے مر کیوں نہ گئے؟'' بوڑھے خان کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اسی وقت دودھ والا ادھر سے نکلا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ لڑکی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ کچھ دور چل کر دودھ والے نے مڑ کر دیکھا۔ لڑکی نے دو انگلیاں اٹھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آیا۔ چپکے سے ایک پوٹلی بندُ روالن کو دی۔ اس

میں دو ہزار کے نوٹ تھے۔

بندُ روالن بڑی نیک لڑکی تھی۔ وہ گھوم پھر کر بیماروں کی مدد کرتی۔ جس کے پاس پیسہ نہ ہوتا اسے پیسہ دیتی۔ ہمدردی کی باتیں کرتی۔ باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دیتی کہ کابل کی نئی سرکار بہت اچھی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس کی اطاعت قبول کرلیں اور واپس جائیں۔ بہت سے لوگ یہ سن کر لاحول پڑھتے۔ لیکن کچھ کم ہمت والے بھی تھے۔ پناہ گزینی کی آزمائش سے تنگ آچکے تھے۔ پھر انھیں منزل کا پتہ بھی نہ تھا۔ وہ سوچ میں پڑ جاتے۔ ان کو بندُ روالن زیادہ سے زیادہ رقم دیتی اور انہی سے زیادہ تر باتیں کرتی۔

بندُ روال دن بھر بیڈ پر پڑا رہتا۔ وہ ہٹّا کٹّا تھا۔ سب سے ہنستا بولتا۔ سیب کھانے کا شوقین تھا۔ خود کھاتا، اوروں کو کھلاتا۔ لیکن کسی سے کہتا کچھ نہ تھا۔ کبھی کبھی خان بابا کے بچے کو پاس بٹھالیتا۔ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا۔ بچہ جب خوش ہوتا تو اپنی کھنجڑی (چھوٹی دف) لے آتا۔ چار بیت گاتا۔ بندُ روال بھی اس کی لَے میں لَے ملاتا۔ پناہ گزینوں کے اس میدانی اسپتال میں لوگوں کے دل گرم ہو جاتے۔ اور پھر کچھ جوان ٹولیاں ٹولیاں بیٹھ جاتے۔ چار بیتوں کا مقابلہ شروع ہو جاتا جو آدھی رات تک چلتا۔

☆

بابا! اللہ بھلا کرے، بابا! اللہ بھلا کرے
اک پیسہ جو دے گا بابا، اجر خدا سے لے گا بابا!
اجر خدا سے، اجر خدا سے، اجر خدا سے

"بھابی! کیا رُوں رُوں کرتی ہو۔ مصرعہ اٹھاؤ۔" اور پھر لڑکے نے اپنی کھنجڑی کو حرکت دی۔ چھن چھن کی آواز آئی۔ لڑکے نے کھنجڑی میں زور سے انگلی ماری۔ ٹب۔ پھر دَف بجانے لگا۔

ٹب ٹب۔ چھن چھن۔۔ بم بم بم بم۔

"ہاں بھابی! ذرا زور سے۔ اجر خدا سے، اجر خدا سے۔" لڑکا تو کھنجڑی بجا بجا کر تان لگاتا۔ لیکن اس کی بھابی اس کا ساتھ نہ دے پاتی۔ دراصل وہ چار بیت میں ماہر نہیں تھی۔ اس کی کسر چھوٹے چھوٹے بچوں نے پوری کی جو اِن دونوں بھکاریوں کے ساتھ شور مچاتے آ ملے تھے۔ آج بازار کے دوکانداروں میں حرکت ہی حرکت تھی۔ آج آغو کے ساتھ اس کی بھابی بھی ہے۔ نہایت حسین، نہایت جمیل بھابی۔ جھولی بھابی کے ہاتھ میں تھی۔ لوگ خود بڑھ بڑھ کر سکّے اور نوٹ اس جھولی میں ڈال رہے تھے۔ بڑے بڑے دوکاندار بھی اپنی اپنی دوکانوں پر کھڑے ہو کر اس حسین و جمیل بھکارن کے حسن کو دیکھ رہے تھے۔

راستے میں دودھ والے کی دوکان تھی۔ اس نے بھی دیکھا۔ مسکرایا۔ "بھابی! میں بھی آجاؤں۔"

''آ جا۔'' اور دودھ والا بھی اس طوفان بدتمیزی میں شامل ہو گیا۔ دودھ والا چار بیت کا ماہر تھا۔ اس نے لڑکے کا ساتھ دیا۔ لڑکے نے ایک جگہ کھڑے ہو کر کھنجڑی اوپر اٹھائی۔ ایڑی پر گھوما اور پھر چار بیت کی تان اڑائی۔ دودھ والا اور سارے بچوں نے مصرعے اٹھائے:

شمس و قمر میں، شام و سحر میں، بحر و بر میں، خشک و تر میں
شجر و حجر میں، لعل و گہر میں، سفر و حضر میں، دنیا بھر میں
حکم اسی کا چلا کرے، بابا! اللہ بھلا کرے

یہ مصرعے ایک شور و غل کے ساتھ فضا میں گونجے تو بازار میں عجیب سماں بندھ گیا۔ بھابی تو اپنی جھولی بھر رہی تھی۔ لڑکا، دودھ والا اور بچے جھوم جھوم کر مصرعے اٹھا رہے تھے۔ اس طرح یہ ٹولی اس طرف جا رہی تھی جدھر ان پناہ گزینوں کا کیمپ تھا جو کابل کی طرفدار فوج سے بغاوت کر کے بھاگ آئے تھے اور انھوں نے یہاں پہاڑوں کی آڑ میں اپنا کیمپ لگا لیا تھا۔ ان فوجیوں کا رہنما کرنل منشا تھا۔ کرنل منشا ہی سارے پناہ گزینوں کی رہنمائی بھی کرتا اور جب موقع پاتا ان مجاہدین کی مدد بھی کرتا جو افغانستان میں روسیوں سے ٹکرا رہے تھے۔

اس وقت سینئر کیپٹن عبدالجبار خاں اپنے جونیئر کپتانوں کے دستوں کی پریڈ کا معائنہ کر رہا تھا اس نے شور سنا۔ ادھر دیکھا۔ چونکا اور بڑھ کر بانس کے پاس پہنچا جو آنے والوں کا راستہ روکتی تھی۔ عبدالجبار نے ڈیوٹی پر کھڑے سپاہی کو

اشارہ کیا۔ وہ سلوٹ کر کے چلا گیا۔ عبدالجبار نے اس کی ڈیوٹی سنبھال لی۔

آغو اور اس کی بھابی کے ساتھ بھیڑ بانس کے پاس پہنچی تو ''خبردار'' کی گرجدار آواز سن کر بچے سہم کر پیچھے ہٹے۔ لیکن آغو اور بھابی اور دودھ والا اور کچھ بڑے بچے گاتے رہے۔ ''حکم اسی کا چلا کرے، بابا اللہ بھلا کرے۔''

''خبردار! ٹھہرو!'' عبدالجبار پھر گرجا۔ اب کی بار آغو بھی ڈر گیا۔ لیکن بھابی نے کیپٹن سے ٹکر لی۔

''کیوں ٹھہروں۔ بھیک نہیں دیتے تو جھڑکتے کیوں ہو، یہ سوا چھ فیٹ کا ڈیل ڈول، یہ چوڑا چکلا سینہ، لیکن اس میں دل نہیں۔''

''بدتمیز! زبان سنبھال کر بات کر۔''

''بدتمیز وہ ہے جو فقیروں کو جھڑکتا ہے۔''

بھابی اور عبدالجبار میں تو تو میں میں شروع ہوئی تو پبلک چپکے سے کھسکنے لگی۔ بچے بھی جانے لگے۔ دیکھتے دیکھتے آغو، بھابی دورہ گئے۔ دودھ والا بھی غائب تھا۔ عبدالجبار نے گرجدار آواز میں پوچھا:

''تو کون ہے؟'' .... ''فقیر ہیں ہم لوگ۔ دیکھتے نہیں۔''

''جوان ہے، محنت مزدوری نہیں کی جاتی؟'' .... ''تقدیر گردش میں ہے۔ مجبوروں پر طنز نہیں کرتے جی۔'' .... ''تیرا کوئی وارث نہیں ہے؟''

''حَیُّ القَیُّوم ہمارا وارث ہے۔ اچھا کچھ دیتے ہو یا ہم واپس جائیں۔''

عبدالجبار ہنس پڑا۔ اس نے دس روپیہ کا نوٹ دیا۔ مڑ کر دیکھا۔ ڈیوٹی کا دوسرا سپاہی آچکا تھا۔ اس نے ایڑی بجا کر سلوٹ کیا۔ عبدالجبار کرنل منشا کے خیمے کی طرف چلا گیا۔ آغو، بھابی دونوں اپنی راہ واپس چلے گئے۔

☆

کرنل منشا اپنے دفتر میں نہایت فکر مند بیٹھا تھا۔ اچانک پردہ ہلا۔ اردلی نے ایڑی ملا کر تڑاق کی آواز کے ساتھ سلوٹ کیا۔ ایک پرچہ میز پر رکھ دیا اور سلوٹ کر کے واپس چلا گیا۔ کرنل نے نظر اٹھائی۔ سوا چھ فیٹ کا سینئر کیپٹن اندر آچکا تھا۔ اس نے سلوٹ کیا۔ کرنل کھڑا ہو گیا۔ کیپٹن سے ہاتھ ملایا۔ کرسی کی طرف دیکھا۔ کیپٹن بیٹھ گیا۔

''آج میں اپنے رہنما کرنل کو بہت فکر مند محسوس کر رہا ہوں۔'' عبدالجبار نے خیریت پوچھنے کے انداز میں عرض کیا۔

''ہم سب مجاہد ہیں جبار! ہم میں نہ کوئی کرنل ہے نہ کیپٹن۔ تمام مجاہد بھائی بھائی ہیں۔''

''ہم اپنے رہنما کے انہی جملوں سے اپنے دلوں میں گرمی پاتے ہیں۔''

''تم جانتے ہو کہ میں کیوں فکر مند ہوں؟''

''میرا قیاس کہتا ہے کہ فریدہ اور علی آپ کو یاد آرہے ہیں۔''

''بے شک انھیں گئے ہوئے دو ماہ ہو گئے۔ میجر قدیر روسیوں کے نرغے

میں پھنس گیا تھا۔ معلوم نہیں ہو سکا علی اور فریدہ اس پر قربان ہو گئے یا فتحیاب واپس آرہے ہیں؟''

''میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ فریدہ اور علی کامیاب واپس آگئے۔''

''کہاں ہیں؟'' کرنل منشا خوشی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

کیپٹن عبدالجبار نے ایک پرچہ پیش کیا۔ کرنل منشا نے پڑھا:

☆فقیر ہیں ہم لوگ ☆ تقدیر گردش میں ہے۔☆ حی القیوم ہمارا وارث ہے۔

کرنل منشا سنجیدہ ہو گیا۔ اپنے جذبات دبا کر بولا۔ ''ہر فقرے کے پہلے تینوں حروف مل کر ہمیں فتح کی نوید سناتے ہیں۔ فریدہ کیمپ میں کیوں نہیں آئی؟ اور کیا علی اس کے ساتھ ہے؟''.................''علی بھی فریدہ کے ساتھ ہے۔''

''کہاں ہے؟''..............................''اسپتال میں۔''

کرنل منشا اسپتال کا نام سن کر پھر متفکر ہو گیا۔ بولا:

''اسپتال میں یہ خلفشار کیسا ہے۔ بہت سے مریض روسیوں کے گن گا رہے ہیں۔ ان پر پیسوں کی بارش کہاں سے ہو رہی ہے۔ یہ راز مجھے پریشان کئے ہے۔''

''ہمارے بوڑھے اور تجربہ کار رہنما کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب کہ فریدہ اور علی اسپتال میں موجود ہیں۔''

''عبدالجبار! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھے تمہارے جیسے قوی بازوؤں کی

ضرورت ہے۔“ .... ”ہمارے بازو آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔“

”جزاک اللہ! اور سنو، مجھ میں ایک کمزوری آ گئی ہے۔“

عبدالجبار ’کیا‘ نہ کہہ سکا۔ اس نے سر نیچا کر لیا۔ اس طرح جیسے پوچھ رہا ہو کہ وہ کمزوری کیا ہے۔ کرنل بولا:

”میں فریدہ اور علی سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہا ہوں۔“

”یہ تو انسان کی فطرت ہے اے میرے رہنما۔“

”یقیناً فریدہ اور علی میجر قدیر کا کوئی پیغام بھی لائے ہوں گے۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“

”دیکھئے فریدہ اور علی اسپتال سے کب فارغ ہوتے ہیں۔“

”لیکن وہ دونوں بھی تو ہم لوگوں سے ملنے کو بے قرار ہوں گے۔“ کیپٹن جبار مسکرایا۔ .... ”میرا دل کہتا ہے کہ کوئی اُفتاد برپا ہونے والی ہے۔“

”آپ نے ہمیں بتایا ہے کہ کوئی افتاد اللہ کے اِذن کے بغیر نہیں آتی۔“

”بے شک، بے شک۔“

”اللہ ہی اس افتاد کو دور بھی کرے گا۔“ .... ”انشاءاللہ۔“

”انشاءاللہ! کل تک سارے راز طشت از بام ہو جائیں گے۔“

”انشاءاللہ۔“

”میں آج اسپتال جانے والا تھا لیکن اب نہیں جاؤں گا۔“

''جبار! میرے پیارے کیپٹن! تم بہت ذہین ہو۔''

''تو انشاءاللہ میں کل شام تک پوری رپورٹ پیش کردوں گا۔''

''جزاک اللہ۔''

کیپٹن عبدالجبار اٹھ کھڑا ہوا اور سلوٹ کر کے دفتر سے نکل گیا۔

☆

دوسرے دن عین اس وقت جب کہ بنڈروالن ایک غریب مریض کو ساڑھے سات سو روپیہ کے تین انجکشن دے رہی تھی۔ کیمپ کے دو جاسوسوں نے اسے حراست میں لے لیا۔ بنڈروالن نے بڑی خاموشی سے اپنے کو جاسوسوں کے حوالے کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''ہتھکڑیوں کی ضرورت نہیں۔ میں بھاگوں گی نہیں۔'' جاسوس اسے بنڈروال کے بیڈ پر لائے۔ بنڈروال کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ تلاشی لی تو پندرہ ہزار روپیوں کے تازہ نوٹ برآمد ہوئے۔ شبہ کی کوئی اور چیز ان کے پاس نہیں نکلی۔ جاسوس پوچھ رہے تھے۔ کہ یہ رقم تم کو کہاں سے ملی۔ تمہارا اصل پتہ کیا ہے؟ بنڈروالن کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت دودھ والا ادھر سے نکلا۔ بنڈروالوں کو گرفتار دیکھا تو چاہا کہ تیزی سے نکل جائے۔ اچانک جوڈو کا زبردست ہاتھ اس کی گردن پر پڑا۔ وہ زمین پر گرا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ بنڈروالن اپنی جگہ پڑی پر گھوم چکی تھی اور اپنا بایاں ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ جوڈو کا وار کرنے سے اس

کا ہاتھ سرخ ہو گیا تھا۔ یہ خطرناک اقدام دیکھ کر جاسوس سپاہیوں نے نہایت پھرتی سے بنڈ روالن اور بنڈ روال کو ہتھکڑی پہنا دی ورنہ وہ تو نہایت شرافت کے ساتھ عورت ذات کو لے جانے والے تھے۔

اس گرفتاری اور دودھ والے کے مارے جانے کی خبر آگ کی طرح سارے بازار میں پھیل گئی۔ لوگ سہم گئے۔ اپنی اپنی دوکانوں پر اٹھ کھڑے ہو گئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پکڑی جانے والی لڑکی وہی بھابی بھکارن ہے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بازار کے لوگ اس پر خوش تھے کہ مجاہد کیمپ کے جاسوس بھی غافل نہیں ہیں۔ آخر انھوں نے اس خطرناک جاسوس بھکارن کو دھر ہی لیا۔ آغو ایک جگہ اپنے باپ کے لئے دوا خرید رہا تھا۔ اس کی نظر بھی بھابی پر پڑی۔ وہ پہلے چونکا پھر سب کچھ سمجھ گیا۔ ناچتا ہوا آگے بڑھا۔ پکارا۔ ''بھابی! اللہ بھلا کرے۔ سفر حضر میں، دنیا بھر میں، حکم اسی کا چلا کرے، بھابی! اللہ بھلا کرے۔''

بھابی اسے دیکھ کر ہنسی۔ کہنے لگی۔ ''آغو میری رقم جاسوسوں نے ہتھیا لی ورنہ تجھے اس وقت بہت دیتی۔''

''نہیں ضرورت بھابی! اس رقم پر باپ لاحول پڑھتے رہے ہیں۔ بھابی! تم کو بھی ہضم نہیں ہوئی اب کھایا پیا اگلو گی۔'' آغو دیدے مٹکاتا، ہاتھ ہلاتا، ناچتا چلا گیا۔ جاسوس دونوں کو لئے ہوئے کیمپ کی طرف چلے۔

عبدالجبار کرنل منشا کے دفتر میں بیٹھا بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے کرنل منشا کو

یقین دلایا تھا کہ فریدہ اور علی آنے والے ہی ہیں۔ اتنے میں رپورٹ ملی کہ بندُر والن بہت خطرناک لڑکی ہے۔ اس نے جوڈو کا ہاتھ مار کر دودھ والے کی گردن توڑ دی اور وہ قتل کی مجرمہ بھی ہے۔

''یہ کون ہے؟ کرنل منشا نے عبدالجبار سے پوچھا۔ اسی وقت اردلی اندر آیا۔ سلوٹ کیا اور ایک پرچہ عبدالجبار کے ہاتھ میں تھما کر چلا گیا۔ عبدالجبار نے وہ پرچہ کرنل منشا کی طرف بڑھا دیا اور فریدہ اور علی کے بسلامت آنے کی مبارک باد دی۔ اسی وقت پردے کے باہر کچھ سائے نظر آئے۔ عبدالجبار نے پھر مبارک باد پیش کی، بیٹی اور داماد سے ملئے۔ کرنل منشا پردے کی طرف دیکھنے لگا۔ پردہ اٹھا۔ بندُر والن اور بندُر روال اندر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ سنتری نے عبدالجبار کے اشارہ سے ہتھکڑی کھول دی۔ کرنل منشا اب پہچان چکا تھا۔ فریدہ، اس کی زبان سے نکلا۔ بندُر والن لپک کر کرنل منشا کے سینے سے جا چمٹی اور بندُر روال کو جبار نے اپنی طرف گھسیٹ کر گلے سے لگا لیا۔ ''علی! کیسے رہے؟''

فریدہ اور علی نے کہا۔ ''ابھی ضروری کام تو باقی ہی ہے۔ فوراً گوالے کی دوکان پر چلئے، حالانکہ فریدہ نے اسے مار ڈالا۔ پھر بھی ہوسکتا ہے کوئی خطرہ موجود ہو۔''

نہایت پھرتی سے علی نے وردی پہنی۔ عبدالجبار کے ساتھ جیپ پر بیٹھا۔ بازار کی طرف چلا۔ چند منٹ میں گوالے کی دوکان پر جا پہنچا۔ گارد پہنچ چکی تھی،

دوکان کو گھیر لیا گیا تھا۔ مقتول کے پاس سے کنجیوں کا گچھا لیا۔ دوکان کھولی۔ علی نے فرش کی چادر ہٹائی۔ نیچے چوکیوں کا فرش تھا۔ چوکیاں ہٹائی گئیں تو صندوق نما اوپر کا حصہ نظر آیا۔ اوپر کا حصہ اٹھایا گیا تو عبدالجبار دانتوں تلے انگلی داب کر رہ گیا۔ اب وہ فریدہ کی ہوشیاری کی داد دینے لگا۔ اگر ذرا دیر کی ہوتی تو اب تک ساڑھے بارہ ہزار پناہ گزین اور سات ہزار مجاہد سپاہی بھک سے اڑ گئے ہوتے۔

اندر سرنگ میں بارود بھری تھی۔ دیا سلائی لگانے کی دیر تھی۔ اسی وقت عبدالجبار نے نہایت ہوشیاری اور تیزی سے بارود نکلوانی شروع کر دی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بارود کے اندر اُسے بہت سے کوہِ شکن بم ملے۔ عبدالجبار نے اپنے جونیئر کیپٹن علی کو گلے سے لگا لیا۔ دو فتحیابیوں کا سہرا علی کے سر رہا۔ میجر قدیر کی مدد کو بروقت پہنچا تھا اور اسے روسیوں کے گھیرے سے نکال آیا تھا، دوسری فتح اس راز کو فاش کرنے کی۔ اللہ اللہ! ظالم اور غاصب روسیوں نے کہاں کہاں فریب اور مکّاری کا جال پھیلا رکھا ہے۔ اللہ مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین!

☆☆☆